

نظام خلافت و امارت
کی
شرعی حیثیت

مولانا عبد العظیم اصلاحی

مکتبہ النجوم

سعید آباد حیدرآباد

۱ حرف حقیقت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عین بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ الرسول منتخب کیا گیا۔ تو نظام خلافت کا قیام عمل میں آیا جس کا سلسلہ خلیفہ سلطان عبدالجید ثانی تک یعنی ۱۳۳۱ سال تک بلا انقطاع رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی کے آمر مصطفیٰ کمال پاشا کی ناعاقبت اندیشی معاندین اسلام کی مخالفت سازشوں اور خود عالم اسلام کی غفلت اور غلط فہمی کی وجہ سے نظام خلافت اسلامیہ کو ختم کر دیا گیا۔

گزشتہ ۷۰ سال سے ملت اسلامیہ بغیر کسی مرکزیت کے اپنے دن گزار رہی ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ عام مسلمان تو ایک طرف مسلم عالموں اور دانشوروں میں بھی اکثریت ایسوں کی ہے کہ جو نظام خلافت کی اہمیت کو یاد تو جانتے ہی نہیں یا اگر جانتے بھی ہیں تو اس معاملہ میں بے اعتنائی برتتے ہیں یا اپنی بے اعتنائی کے لیے کچھ ایسے عذرات تراشتے ہیں کہ اب نظام خلافت کا احیاء ممکن نہیں ہے۔

اس موقع پر نظام خلافت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خلیفہ قرآن مجید کا اہم تعارفی لفظ ہے جو سہ حرفی مادہ خ۔ ل۔ ف۔ سے مشتق ہے۔ خلف کے معنی متاخر ہونے۔ پیچھے رہ جانے، بعد میں آنے یا کسی کے جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ سلف کی ضد ہے۔ جس کے معنی مقدم ہونے یا پہلے گزر جانے کے ہیں۔ اس طرح خلافت کے مرادوی معنی قائم مقامی کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: "انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا" (سورہ الانعام - ۱۶۵)۔ یہ بات لائق غور ہے کہ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ بنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا بے معنی بات ہوتی ہے۔ عام طور پر اس آیت کے معنی یوں لیے جاتے ہیں کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب (vica gerent) مقرر کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ نہ تو انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہو سکتا ہے اور نہ ہی قائم مقام۔ ان معنوں میں اللہ تعالیٰ نے خلافت انسان کے تفویض نہیں کی۔ زمین پر ہر آن فرمان برداری، حاکمی، شاہی اور خدائی سب اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ مقام بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ قرآن مجید میں استخلاف کے معنی ایک قوم کی جگہ دوسری کو اس کا جانشین بنانا ہے۔ ان معنوں میں استخلاف کے معنی حاکم یا مقتدر ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر کردہ قانون بقائے اصلہ کے تحت ایک نوع مخلوق کو دوسری کا جانشین یا قائم مقام بناتا رہا۔ عالم حیوانات کی کشمکش حیات میں جسمانی زور ہی کسی جنس کے قیام کے لیے کافی نہیں بلکہ بھلا کا اصلی راز صلاحیت اور

استعداد ہے۔ جس نوع حیوانی میں موانعات فطرت کے مقابلہ کی صلاحیت پائی گئی وہی قانون الہی کے مطابق مستقلف فی الارض یعنی حاکم قرار پائی۔ اگر یہ قانون نہ ہوتا تو آج وہ عظیم الخبیث جانور جو انسان کی خلقت سے لاکھوں سال قبل روئے زمین پر کثرت سے موجود تھے دنیا پر مسلط ہو جاتے، غرض ایک نوع کو اللہ تعالیٰ دوسری نوع کا جانشین مہیا کر رہا تھا کہ اس نے انسان کو حلیفہ یعنی دوسری انواع کا جانشین یا بہ الفاظ دیگر دوئے زمین پر حاکم بنایا سورہ انعام کی معذکرہ آخری آیت اور سورہ فاطر کی آیت ۳۹ کا بھی مفہوم ہے۔ "وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں حلیفہ (حاکم) بنایا" (۳۵-۳۹)

اللہ تعالیٰ انسانوں میں بھی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بناتا ہے چنانچہ فرمایا "سو اگر تم پھر جاؤ تو میں تمہیں وہ (پیام) پہنچا دیا ہے جو مجھے دیکر تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہارے بجائے دوسرے لوگوں کو حلیفہ (دوسری اقوام کا جانشین اور حاکم) بنادے گا۔ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے" (۱۱-۵۷)

اسی طرح فرمایا:

"اے اوادوہم نے تجھے زمین میں حلیفہ (سابقہ امتوں کا قائم مقام اور حاکم) بنایا ہے۔" (۳۸-۲۶)

اسی طرح فرمایا:

اور یاد کرو جب اس (تمہارے رب) نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا حلیفہ (جانشین یعنی حاکم) بنایا سورہ الاحکام آیت۔ (۲۹) ع۔ ۱

انسانی معاشرہ کی حد تک بقا کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ لازم و ملزوم ہیں جس جماعت کے افراد میں یہ دونوں باتیں ہوں وہی اصل ہے۔ اس مخالفت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ شرط رکھی ہے کہ انسان ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دے۔ آیت اختلاف میں ارشاد ہوا:

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ان کو اسی طرح زمین میں حلیفہ (حاکم مقرر) بنایا جائے گا جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو حلیفہ بنایا جا چکا ہے" (سورہ نور آیت ۵۵)

سورہ الانبیاء میں بھی آیت اختلاف کا مفہوم ایک دو سربے انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے" (سورہ الانبیاء)

آیت۔ (۱۰۵)

انسان کو اللہ کا حلیفہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس اختلاف سے اصل مسئلہ پر کوئی فرق نہیں

(رجوع اصطلاحي)۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں خلافت اور وراثت تقریباً ایک ہی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں چاہے خلافت (جانشین) ہو یا وراثت، اہم سابقہ کی ہے اور حکومت اور اقتدار کے معنی میں ہے جب ایک قوم اپنی صلاحیت (ایمان اور نیک عمل) اکھو دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مٹا کر اس کی جگہ ایسی قوم کو لاتا ہے جو با ایمان ہو، عمل صالح کو اپنا شعار بنا چکی ہو۔ کسی قوم کو مٹانے کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ اس قوم کو بالکل نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ ایک قوم کو مٹانے کے بعد بھی اس قوم کے افراد موجود ہوتے ہیں۔ اس کی جگہ جس قوم کو لایا جاتا ہے اس کے افراد بھی جملے سے موجود ہوتے ہیں۔ پھر ایک قوم کو دوسری قوم کا جانشین بنانے کے کیا معنی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی صلاحیت کے بموجب اس کو اقتدار سے نوازتا ہے۔ ایک قوم کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو اس کا جانشین بنانے کے معنی ایک قوم کو اقتدار سے محروم کر کے اس کی جگہ دوسری قوم کو اقتدار سے نوازنا اور دنیا کی امامت تفویض کرنا ہے۔ قوموں کو اقتدار سے نوازنے یا ان کے اقتدار سے محروم کرنے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانون کے تحت امتہائی انصاف سے ہوتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایمان کی حامل اور اعمال صالحہ کی پابند تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون اور وعدہ کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس جماعت کو یعنی امت مسلمہ کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معتقد طور پر اپنا امیر منتخب کیا تو وہ بجا طور پر خلیفہ رسول کہلائے یعنی رسول کے بعد آنے والے یا ان کے جانشین۔ اس طرح مابعد قرآنی لٹریچر میں لفظ خلافت اس عظیم نظام کے لیے استعمال ہوا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور دنیا کی امامت کا فرض ادا کیا۔

خلافت کی بنیاد پچھلے کسی سیاسی نظام مثلاً قیصر و کسری یا عرب قبائلی نظم کے انداز پر نہیں رکھی گئی بلکہ وہ ایک جدید نظام تھا جس کی بنیاد قرآن مجید کے اس بلند خیال پر رکھی گئی کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلم عوام کو جو ملکی اختیارات حاصل ہیں اور اقوام عالم میں جو نمایاں مقام حاصل ہے ان کی حیثیت ایک مقدس امامت کی ہے۔

مہناج نبوت

اس موقع پر مہناج نبوت کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مہناج کے معنی ہیں راستہ، دستور یا طریقہ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد کوئی رسول یا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے بعد فرائض رسالت مسلمانوں کی جماعت کو تفویض ہوئے۔ یہ ایک ایسا عظیم اعزاز اور بڑی ذمہ داری ہے کہ سابق میں کسی امت کو یہ اعزاز اور ذمہ داری حاصل نہیں ہوئی۔ امت مسلمہ من حیث الکل مہنہج نبوت پر فائز ہے یہ حق مشترکہ طور پر باعث عزت اور موجب فخر تو یقیناً ہے لیکن اگر امت کا کوئی فرد یہ ادعا کرے کہ وہ مہنہج نبوت پر فائز ہے تو اس کا دعویٰ قطعی باطل قرار پائے گا۔ یہ حق اور یہ ذمہ داری امت مسلمہ کی مشترکہ امامت اور اجتماعی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان جسد واحد کی حیثیت سے ملی زندگی بسر کریں اور وحدت خیال اور وحدت عمل کا اظہار کریں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت مسلمہ کا دینی اور دنیوی خلیفہ (امیر المؤمنین) جو جو تمام مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہو۔

خلافت ایک ایسا عجیب و غریب ملٹی نیشنل (multi national) ادارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بموجب ایک قوم کی جگہ دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی رہی اور یہ سب امتیں خلافت کے دائرہ میں رہیں۔ عربوں کی سیاست ختم ہوئی تو ترکوں، بلوچیوں، تاتاریوں وغیرہ نے یکے بعد دیگرے عنان قیادت سنبھالی۔ ایک ایک قوم آگے بڑھی اور اس نے مرکزی کردار ادا کیا۔ خلافت قائم رہی اور مرکزیت باقی رہی۔

انسانیت کی نشوونما ایک ایسی انسانی جماعت کی ذمہ داری ہے جو خالق کائنات کے منشاء کے تحت اس اہم اور مقدس کام کو شعوری طور پر انجام دے خلافت کو ایسی انسانی جماعت کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔

مسلمانوں کی حیات اجتماعی کا سب سے بڑا سانچہ سلسلہ خلافت کا انقطاع ہے خلافت کا خاتمہ خود مسلمانوں کے زوال کی علامت تو تھا لیکن اسلام کے انحطاط اور مسلمانوں کے قیادت اور خلافت سے محروم ہو جانے سے دنیا ایک نظریہ حیات اور عملی نظام سے محروم ہو گئی۔ انسانی زندگی کا لائحہ عمل متاخر ہو گیا اور غلط فلسفیانہ تصورات کا اثر فضا میں چاروں طرف پھیل گیا، اگر خلافت قائم رہتی اور مسلمان اپنے بنیادی فرض کو انجام دیتے ہوئے علوم اور فلسفوں کو اس ذہن سے آگے بڑھاتے جس کی نشاندہی قرآن مجید میں کی گئی ہے تو باطل فلسفے اس طرح ہرگز فروغ نہ پاتے جس طرح ان کافروں نے ہم بھگت رہے ہیں۔ اور اس طرح دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ خلافت کا خاتمہ ہوا اور علوم سے مسلمانوں کو سرد کار نہ رہا تو کفر نے مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کے بعض حقائق اور علم کو لیکر اور اس میں باطل کی آمیزش کر کے اسدلال کی قوت کے سہارے ان کو دنیا میں پھیلا دیا۔ موجودہ ہتہذب کی تمام خرابیوں

اور کوتاہیوں کی ایک اہم وجہ بھی باطل فلسفے ہیں، انہی باطل نظریات کی کوتاہیوں سے موجودہ دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ دنیا کو ان سے نجات دلانا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔

مسلمان ہی دنیا کی مسلمہ علمی صداقتوں کے وارث ہیں کیونکہ یہ صداقتیں قرآن مجید کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ جب مسلمانوں نے ان علمی صداقتوں کی نکاش بند کر دی اور ان کی ترقی میں اپنا حصہ ادا نہ کیا تو یہ علمی صداقتیں نہ صرف باطل کے ساتھ ملوث ہو گئیں بلکہ باطل فلسفوں کی زینت بن گئیں۔ یہ الفاظ دیگر علمی صداقتوں کے بل بوتے پر باطل کی جلوہ فروشی خلافت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں نے خلافت کو ختم ہو جانے دیا۔ بلاشبہ یہ ایک مجرمانہ کوتاہی تھی۔ دنیا کو مسلمانوں کی خلافت کے ختم ہو جانے سے بد قسمتی سے دو چار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتے جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر دین کے علمبرداروں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔

اگر خلافت کا نظام قائم رہتا تو مسلمان علیحدہ علیحدہ غول کی شکل میں نہ ہوتے بلکہ خلافت اسلامیہ کے تحت ان کی حیثیت امت واحدہ کی ہوتی۔

خلافت کے اختتام اور مسلمانوں کے انحطاط کے نتیجہ میں جو قوتیں ابھریں وہی آج کی دنیا کی تمام خرابیوں کا اصل سبب ہیں۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خلافت مسلمانوں کے لیے ایک دینی ضرورت ہے۔ خلافت کا قیام جو اسلامی مملکت کی مستند شکل ہے محض ایک سیاسی نظام ہی نہیں بلکہ ایک شرعی ضرورت ہے جس کے بغیر دین کے اہم ارکان متاثر ہیں۔ نظام خلافت، اسلام کی بقاء اس کی عالمی ترویج اور مدافعت کے لیے ناگزیر ہے۔ خلافت سے محرومی شریعت کے بنیادی احکام کے اعتراض کے مترادف ہے۔ جہاں تک دینی ضرورت کا تعلق ہے صرف چند امور غائقہ خور ہیں۔ اسلام میں نہ کلیسائی نظام ہے نہ پروہتی نظام۔ لیکن اسلامی عبادات کی ادائی میں تنظیم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں پر جو فرائض عائد کرتا ہے ان کی بجا آوری باہمی ربط کے بغیر ممکن نہیں۔ بعض فرائض نوعیت کے اعتبار سے صریحاً اجتماعی ہیں۔ پروہتی نظام سے بچنے کے لیے اسلام نے ایسی ملت تنظیم کی جو اجتماعی فرائض ادا کر سکے اسلامی مملکت کی بنیادی غرض یہی ہے کہ وہ ملت کی تنظیم کی سربراہ ہو۔

صلوٰۃ دین کا دوسرا اہم رکن ہے امیر المؤمنین اور ان کے تحت تمام اصحاب اقتدار کا فرض ہے کہ اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کریں۔ صلوٰۃ جمعہ کی تنظیمی سطح پر بڑی اہمیت ہے۔ خطبہ جمعہ کی اہمیت کا سرسری اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسلمانان عالم کا خواہ وہ حدود خلافت میں رہتے ہوں یا باہر، ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں مقررہ دن اور مقررہ وقت پر سب مسلمان جمع ہو جاتے ہیں۔ خطیب جمعہ کا خلیفہ کی جانب سے مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ خطبہ جمعہ خلفاء کے تسلسل کے اظہار اور خلیفہ وقت کے نام سے یا اس کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں خلیفہ کا نام لینا رسماً ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں خطبہ جمعہ کی افادیت اور معنویت باقی نہیں رہی

جو لوگ جلدیے منعقد کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں اس دشواری کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو جمع کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ تاریخ اور وقت کا تعین کرنا۔ سب کو اس کی اطلاع دینا۔ جلسہ کے لیے مقرر کا انتظام کرنا وغیرہ۔ اسلام نے دن۔ وقت مقام اور خطیب کے انتخاب کے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے پلیٹ فارم مس مستقل اہتمام کر دیا۔ اور اس نزاکت کے ساتھ کہ تمام دنیا میں پڑھے جانے والے خطبات جمعہ مشرقی حکمت عملی کی نشاندہی کرتے ہیں اور ایک ہی مرکزی قوت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ ایسا اہتمام ہے جو عقل انسانی کو دنگ کر دیتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی غیر معمولی ترقیوں کے باوجود ایسے خود کار اور مکمل انتظام کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سارا اہتمام اور اس کا ڈھانچہ عملاً تو باقی ہے لیکن اس کا ایک اہم بنیادی جز یعنی خطیب کو مقرر کرنے والی اتھارٹی باقی نہیں۔ جس کے نتیجہ میں خطبہ جمعہ کی روح اور اس کی افادیت سے مسلمان محروم ہو گئے۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ عام صدقات و خیرات اور زکوٰۃ میں ایک واضح فرق ہے۔ صدقہ و خیرات اختیاری ہیں جب کہ زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہے۔ صدقہ و خیرات ایک فرد دوسرے فرد کو دینا ہے۔ جس کو دیا جائے اس پر دینے والے کا احسان ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم بطور نمکس خلیفہ وصول کرتا ہے۔ اور جو افراد مستحق شرعی ہوں ان کو پہنچا دی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں کسی احسان کا تصور نہیں۔ خلافت کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ بنیادی رکن متاثر ہے۔ اور ایک انفرادی عمل اور اختیاری فعل بن کر رہ گیا ہے۔

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ حج کے موقع پر تمام دنیا سے آئے ہوئے مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع میں خطبہ خلیفہ وقت یا ان کی جانب سے نامزد کئے ہوئے امیر حج کی ذمہ داری ہے۔ خلیفہ کی عدم موجودگی میں اسلام کا یہ اہم رکن متاثر ہے۔

جہاد اسلام کا اہم رکن ہے۔ جہاد کی بنیادی اہمیت اس کے حکم کی برتری ہے اس اہم اور مقدس کام کی ادائیگی میں اجتماعی تنظیم و جدوجہد ضروری ہے۔ اس کام میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے ان کو برداشت کریں۔ پوری طاقت سے جدوجہد کریں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش بھی جہاد ہے۔ اللہ کے حکم کی برتری میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں اور غنڈہ گردی کی جائے تب آخری تدبیر کے طور پر اس کا مقابلہ کیا جائے اور اپنی جان کی بازی لگادی جائے۔ خلیفہ کے حکم کے بغیر جہاد کی یہ آخری شکل مسلمانوں پر فرض نہیں۔ اجتہادی تمام کوششیں بھی ان ہی ضوابط پر ہونا ضروری ہے۔ جن کی نشاندہی خلیفہ وقت کی جانب سے ہوں۔ خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسلام کا یہ اہم رکن متاثر ہے۔

یعنی حال دو سرے احکام کا ہے۔ قرآن مجید میں ناپ تول کا خیال رکھنے کی تاکید بار بار آئی ہے۔ ان احکام کی تعمیل اور پابندی امیر المؤمنین ہی کے حکم سے ہوتی ہے جو محتسب کے ذریعہ اوزان اور پیمانہ جات پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح محتسب اس بات کی نگرانی بھی کرتے ہیں کہ احتکار (ذخیرہ اندوزی) نہ ہونے پائے اور یہ صنعت و تجارت میں جھوٹ۔ خیانت اور فریب دی نہ ہو۔

یہ تو رہی ارکان اور احکام اسلام کی بات۔ اگر غور سے دیکھیں تو خود قرآن مجید کے بیشتر احکام خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے نافذ العمل باقی نہیں رہے۔ قرآن کا واضح حکم ہے۔ اطاعت کرو اسلام کی۔ رسول کی۔ اور ان کی جو تم میں اولی الامر ہیں۔ (سورہ النساء۔ ۵۹) اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اولی الامر صرف امیر المؤمنین (خلیفہ) ہو سکتا ہے۔ ورنہ دنیا کے مسلمان اپنے اپنے علاقوں کے حکمرانوں کو اولی الامر تسلیم کریں تو ویسی ہی سر پھسول ہوگی جیسی کہ آج ہو رہی ہے۔ اولی الامر کی عدم موجودگی ایک عجیب و غریب صورتحال ہے۔ جس کی سنگینی کا پورا پورا اندازہ ایک حالیہ واقعہ سے ہوتا ہے۔ کلکتہ ہائیکورٹ میں درخواست رٹ پیش ہوئی کہ قرآن مجید کی جو بیس آیتوں کو (band) کیا جائے۔ اگر یہ درخواست رٹ منظور ہو جاتی تو ہندوستان کی حد تک چند آیات قرآنی پر پابندی عائد ہو جاتی۔ لیکن نظام خلافت کے برخاست ہو جانے سے قرآن بے اثر اور کم اثر ہو گیا۔ وہ تمام آیتیں جو خلافت اور اجتماعی زندگی سے راست یا بالواسطہ متعلق ہیں نکال دینے کے لیے تورہ لکھیں لیکن معافاً معطل ہو گئیں اور یہ جب اس انداز سے ہوا کہ مسلمان اس صورتحال کی سنگینی کا پورا ادراک نہ کر سکے۔

خلافت اسلامیہ کو ختم ہونے سے سال گزر گئے۔ اس مدت میں ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچا اسکو تصور میں

لابا مشکل ہے۔ گویا ستر صدیاں گزر گئیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے فائدے سے یکسر محروم ہو کر اب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں آزادی اقوام کی ہوا چلی۔ خلافت اسلامیہ کے مختلف صوبوں کو جو خلافت اسلامیہ کے خاتمہ کے بعد برطانوی۔ فرانسیسی اور دوسرے سامراجی ممالک کے غلام تھے۔ آزاد کیا گیا لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسلام کو غرب و غم کی تقسیم کار و ادارہ تھا۔ اب خود غرب کی ریاستیں بیسیوں ذیلی وحدتوں میں بٹ گئیں۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سامراجی طاقتوں یعنی برطانیہ۔ فرانس، امریکہ اور روس نے اپنے ساتھ وپر داخیز مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو انتشار و اختلافات میں الجھائے رکھا مسلمان حکمران جو شخصی مملوک کی بناء پر سامراجیوں کے آگے کار بن گئے۔ اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی افکار سے مرعوب ہے دونوں احباب نے خلافت کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ذہنوں سے خلافت کی عظمت کو محو کرنے کے متعلق نئے طریقہ اختیار کیے گئے مثلاً خلیفہ بن الاقوامی سطح پر مسلمانان عالم کے اقتدار کا مظہر ہوتا ہے اور بیک وقت دنیا میں ایک ہی خلیفہ ہوتا ہے۔ اردو میں لفظ خلیفہ کو نائی۔ درزی وغیرہ پیشہ کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ یا پھر صوفیوں کی اصطلاح میں خلیفہ ان مریدوں کو کہا جاتا ہے جنہیں مرشد بیعت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔ خلیفہ کے معنی خواہ سرقیانہ ہو یا صوفیانہ اصل لفظ کی جو عظمت تھی وہ ذہنوں میں باقی نہ رہی۔ اور عملی گلی خلیفہ ہو گئے۔ اس کے باوجود یہ بات خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس دینی ضرورت کو تسلیم کرنے عیار ہے اور ملت کا سواد اعظم اس انتشار اور اختلاف سے بری ہے جس میں دشمنان اسلام کے خود غرض ایجنٹ الجھے ہوئے ہیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہر قوم کو اپنے ورثہ کے تحفظ کی خواہش ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کے لیے یہ ورثہ خلافت اسلامیہ کا تسلسل ہے۔ خلافت کے احیاء ہی سے انشاء اللہ مسلمانوں کے بلکہ عالم انسانیت کے تمام مسائل حل ہوں گے۔

بعض گوشوں سے اس قسم کے شیطانی دوسے پیدا کیے جاتے ہیں کہ خلافت کا احیاء مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مسلمانوں کا ذہن اس تعلق سے بالکل صاف ہونا چاہیے۔ اگر خلافت ایک دینی ضرورت ہے اور انسانیت کی موجودہ خرابیوں کا واحد حل ہے تو اس کا احیاء ہونا چاہیے۔ اگر اسلام حق ہے اور امر خلافت اسلام کی بنیادی ضرورت ہے اور اگر مسلمانان عالم کا روئے زمین پر بالآخر ایک ہم عنصر بننا منشاء الہی ہے تو خلافت اسلامیہ کا قیام ضرور عمل میں آئیگا ضرورت و وسیع پیمانہ پر احساس پیدا کرنے کی ہے۔ عزم کی ہے۔ استطاعت کی ہے۔ یقین کی ہے۔ اور سعی و کوشش

کی ہے۔ اس بات کو مسلمانوں میں عام کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی اور نظام خلافت کا بدل نہیں ہو سکتا۔ بین الاقوامی سطح پر مختلف اسلامی ادارے مثلاً رابطہ العالم اسلامی، اسلامی وزراء کے خارجہ کی کانفرنس اور ایسے ہی دوسرے ادارے خواہ کتنے ہی مفید خدمات کیوں نہ انجام دیں خلافت کے متبادل نہیں ہو سکتے۔

ایسا نہیں کہ ۱۹۲۳ء میں خلافت کو ختم کر دیا گیا تو مسلمانان عالم نے اس صورت حال کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا۔ امت اسلامیہ کی اہل نظر شخصیتوں نے جن میں برصغیر کے مولانا محمد اور سید سلیمان ندوی، روس کے موسیٰ چارالندہ مصر کے محمد علی علویہ پاشا اور سید رشید رضا مدیر المنار، انڈونیشیا کے سعید عمر شکر و مفتو اور عرب لیگ کے مفتی امین الحسینی شامل تھے۔ باہم صلاح و مشورہ کر کے ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں ایک جمعیت ج کے اجتماع کے موقع پر قائم کی اور اس کا نام موتمر العالم اسلامی رکھا۔ یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے۔ دنیا کے ۶۲ ملکوں میں اس کی شاخیں یا فلاحہ ادارے قائم ہیں۔ جو کوشش کر رہے ہیں کہ خلافت کا پھر سے احیاء ہو۔

خلافت کے قیام کے سلسلہ میں کچھ دستوری تجاویز بھی سامنے آئی ہیں: پروفیسر آل احمد عابدی پر نپال گورنٹ کلج آف ایجوکیشن ملتان نے ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ کے قیام کے مقصد سے آئینی تجاویز کا خاکہ مرتب کیا جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رابطہ العالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ میں پیش کیا۔ اس کا اردو ترجمہ "جذب بانم" کے نام سے کاروان ادب ملتان نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ یہ مسلم مملکتوں کے کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز ہے۔ کنفیڈریشن کی حکومت صدر، انتظامیہ، مجلس ملی اور مجلس علماء پر مشتمل ہوگی۔ مجلس ملی کی تشکیل کے لیے ہر رکن ریاست سے ۱۱ نمائندے لئے جائیں گے۔ صدر کا انتخاب پانچ سال کے لیے ہوگا۔ مجلس علماء ۳۱ عالموں پر مشتمل ہوگی۔ اس دستوری خاکہ کا مقصد اسلامی نظریاتی محرکات پر مبنی مسلم مملکتوں کی سیاسی وحدت قائم کرنا ہے لیکن دستور میں کسی جگہ اور نہ ہی پیش لفظ اور دہباچہ میں احیاء خلافت کی بات کی گئی ہے۔ دستور میں کنفیڈریشن کے صدر کے لیے خلیفہ یا امیر المؤمنین کا لقب استعمال نہیں کیا گیا۔ اس طرح ایک مفید تجویز کو خلافت کے احیاء سے قریب تر لانے کے باوجود یہ سکوت بری طرح کھٹکتا ہے۔

حیدرآباد سے جناب سید شاہ محسن الدین محمد محمد الحسینی فیض نے اپریل ۱۹۶۹ء میں ایک مسودہ دستور خلافت اسلامیہ مرتب و شائع کیا۔ اس دستور کا خاکہ جمہوری اساس پر مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی مزاج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دستور کے بموجب دولت اسلامیہ اس عظیم ادارہ کے رکن ہونگے۔ غیر مسلم ممالک کی حد تک مسلم آبادی کے اساس

پر ادارہ کے ارکان کا انتخاب عمل میں آئیگا۔

ضرورت ہے کہ ان بنیادی خاکوں کو سامنے رکھ کر تجاویز مرتب کی جائیں۔ مسلم رائے عامہ کو ہر ملک میں ہموار کیا جائے۔ غیر مسلم رائے عامہ کو بھی ان خطوط پر ہموار کیا جائے کہ ادارہ خلافت تمام عالم انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ احیاء خلافت کے راستہ میں جو رکاوٹیں نظر آئیں ان کو دالٹنڈی اور حکمت سے دور کرنا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں کہ خلافت کا احیاء ہوگا اور باب عالی سے ایسے فیصلے صادر ہونگے جو انسانیت کے لیے لالاح کا باعث ہونگے اور الہی نظام سر بلند و کامران ہوگا۔

راقم الحروف نے احیاء خلافت کے سلسلہ میں ایک استفتاء مرتب کر کے علمائے کرام کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ مولانا عبد العظیم اصلاحی نے اس استفتاء کو دیکھ کر فرمایا کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں استفتاء کے تمام سوالات کا احاطہ موجود ہے۔ میں نے اس مقالہ کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ مولانا نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ اور نظام خلافت کی شرعی حیثیت پر بنیاد عالمائے نظر ڈالی ہے۔ یہ مقالہ اس سے قبل رسالہ رھگڑ میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ بات موجب مسرت ہے کہ اب اس کو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ نظام خلافت کے بارے میں یہ چند مسطور اہل نظر کی توجہ کے لائق منھسور ہونگے۔

فقط۔ حسن الدین احمد

عزیز باغ۔ حیدرآباد ۲۴

۱۰ جنوری ۱۹۹۳ء

تمہید

نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے اس موضوع پر گفتگو کیلئے بطور تمہید موجودہ عالم اسلام کے ایک مستند عالم باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

”اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں ہے چند مختلف لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں وہ زندگی کا نظام ہے وہ زمانہ کی فضا طبعیت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے۔ اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت زندگی کے مقصد و معیار بننا اور یہ نظر اور انسانی فہمیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق حاصل ہو۔ اسی کے صحیح نمائندہ دنیا کیلئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :- الذین ان مکہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نہوا عن المنکر و اللہ عاقبہ الامور (۲۲-۴۱) ترجمہ :- یہ مظلوم مسلمان وہ ہے کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا ”یعنی ان کا حکم چلنے لگا تو وہ نماز قائم کریں گے داد اے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کا رہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ایک اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی فوجداری معطل ہو جاتا ہے اسی لئے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی۔ اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا۔ جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کیلئے حضرت حسینؑ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نا اہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔“ (اسخ - سیرت احمد شہید حصہ اول صفحہ ۵۰، ۵۱) مولانا سید ابوالحسن علی

”اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں۔ ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تعظیم پھر اس کی ترویج و توسیع انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواہی بھی ہے۔ ایک ایسی شائستہ خوش اسلوب پرسکون اور پر امن زندگی کیلئے فضا ہموار کرنا بھی ہے جس میں خالق کے فرائض مخلوق کے حقوق دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے۔ جس کی صلاحیت انسان کی فطرت میں دیت کی گئی ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مقاصد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں کبھی خود ساختہ قوانین کبھی مطلق العنانی اور جاہ و اقتدار کی ہوس سے۔ اس کے لئے ایک منزل من اللہ قانون آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت و حاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت و امارت ضروری ہے۔ (اسخ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۵۹)

مولانا سید ابوالحسن علی

تین مسلمات

اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے۔ یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر یا کسی شعبہ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے۔ نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَآمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔
آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔ اونے پونے کی سودا بازی قابل قبول اور باعث ہلاکت ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ الْآخِرَىٰ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ لِيُغَافِلَ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝
تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو پس یہ تم میں سے جو بھی کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت شدید ترین عذاب میں دھکیلے جاتیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علمائے اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے۔ اس کا آپ مطالعہ کریں اور دیکھیں انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصول قانون اور قانونی نظریہ موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیم نے امور دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظام زندگی سمجھایا گیا ہے۔

جان لو امور دین اعتقادات، عبادات، معاملات، حدود و تعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔ اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں۔ (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالملک (۳) ایمان بالرسول (۴) ایمان بالکتاب (۵) ایمان بالیوم الآخر عبادات بھی پانچ ہیں: نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد۔ معاملات بھی پانچ ہیں: مالی، معاوضات، مناکحات، محتاصات، امانات، ترکہ و میراث۔ حدود و تعزیرات بھی اصولاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں: قتل نفس، سلب مال، ہتک ستر، ہتک عزت، قطع نسل۔ آداب چار ہیں: اخلاق، شامل حسنہ، سیاسیات، معاشرتی مسائل۔

”البحر الرائق کتاب الطہارۃ“

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں: لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کیلئے شریعت کی اجازت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ فقہانہ نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت، کوئی فعل، کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں۔ عزیمت اور رخصت۔ عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بنا پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کے اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہو سکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتے کے شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے بہت

شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث۔ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوی پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد۔

۲ اللہ تعالیٰ حاکم علی الارطلاق ہے: مشریت اسلامی جب ہر شعبہ زندگی کے لیے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہو سکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام قانون کی ہمہ گیری سے قانون ساز کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔ اِنْ اُحْكَمْ اِلَّا اللّٰهُ حکم صرف اللہ کیلئے ہے۔

فَاَلْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ حکم اللہ ہی کیلئے ہے جو بالادست اور بڑا ہے
لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خَالِقِ الْاَفْرَاقِ میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے
فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے: وَالَّذِي يَعْلَمُ مِنَ التَّوْضِيحِ فِي ضَبْطِهَا اَنَّ الْحُكْمَ مَفْتَقَرٌ اِلَى الْحَاكِمِ وَالْمَحْكُومُ عَلَيْهِ وَالْمَحْكُومُ بِهِ فَالْحَاكِمُ هُوَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَالْمَحْكُومُ عَلَيْهِ هُوَ الْمَكْلُوفُ وَالْمَحْكُومُ بِهِ فَعَلِ الْمَكْلُوفِ (نور الانوار ص ۲۶۶)

قواعد کے ضبط میں توضیح جسے چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکم محتاج ہے حاکم محکوم علیہ اور محکوم بہ کا پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکلف اور محکوم بہ مکلف کا فعل ہے۔ توضیح میں مزید وضاحت:

القسم الثانی من الكتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وهو اللہ تعالیٰ لا العقل علی ما مر فی باب الامر (مشت)
کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ عقل جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا۔ لاحکم الامن اللہ تعالیٰ باجماع الائمة لا کما فی

کتاب بعض المشائخ ان هذا عندنا وعند المعتزله الحاكم العقل فان هذا مما لا يجتري عليه احد من يدعي الاسلام
 حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا بعض مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ
 ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی
 جرات کوئی بدعی اسلام نہیں کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص کوئی خاندان کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم
 کرنے کی مجاز نہیں ہے اسی طرح مجروح عقل اور تجربہ کی بنیاد پر کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا
 اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل و تجربہ
 سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لیے فقہ کو اس کی ضرورت پڑی کہ صریح لفظوں میں عقل کی
 حاکمیت کا انکار کر دیا جائے لیکن قابل رنج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت
 پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبرداران اسلام کے مقابل میں ہے
 ۳ اصول شریعت : حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کیلئے
 صرف چار ذرائع ہیں کتاب سنت اجماع قیاس کتاب تو اس لیے گوہ صریح طور پر
 حاکم اعلیٰ کا کلام ہے اور سنت اس لیے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم
 کا نام سنت ہے اور اجماع اس لیے کہ کتاب و سنت سے ثابت شدہ ہے یا قیاس اور
 اس کی دوسری شاخیں استحسان استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں
 ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب و سنت کے محقق احکام معلوم کرنے کے
 ذریعے بنتے ہیں بجاتے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو بھی حکم معلوم ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا اور ان طریقوں

کو چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریحی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے خواہ وہ قانون اور ضابطہ کوئی ایک فرد بنائے یا کوئی قوم اور کسی ملک کے جمہور۔

دین کی صفہ گیری کا تقاضا: مذکورہ تینوں مسلمات اسلام کا ہمہ گیر ہونا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شریعت کے اصول اور بقہ کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان کا سر یا دین میں گم ہو جائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کر سکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعییت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام نظام خلافت اور ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو۔ کس دلیل کی بنا پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے۔ یہ زمین اس کی آسمان اس کا ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہو سکتا ہے۔ کیا اس کی کوئی سند پیش کی جاسکتی ہے کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کر دیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لیے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا شرعی مسلمات اسوۃ انبیاء خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ اور خدائی ہدایت کے تحت ہونہ کہ اس سے آزاد۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور سے چور کے بارے میں حکم ہے۔ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا۔ چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔ یہ ایک کھل ہوا حکم ہے۔ جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بتایا گیا

۱۸
 بلکہ تمام مسئلوں سے کہا جا رہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کر سکتا
 اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس
 کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جس دواحد بن جائے اس کا ایک قائد اور
 سربراہ ہو اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو جس کے ذریعے اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے
 امت میں انتشار اور انارکی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہو سکتی
 اسی بنا پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔
 وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی
 سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو)۔

حضور نے فرمایا: مَنْ شَدَّ عَنِ الْجَمَاعَةِ شَدَّ مِنَ النَّارِ جو جماعت سے الگ ہوا تو آگ
 میں گیا عَلَيكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّبُّ مِنَ الْعُغْمِ الْقَاصِيَةِ تم پر جماعت لازم ہے اس
 لیے کہ بھیڑ یا انہی بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں۔
 عہد رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت
 کی راہبر اور ذمہ دار تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے
 ہاتھوں انجام پاتے اور آپ کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے اس ذمہ داری کو کما حقہ
 ادا کیا اور رسول خدا کی امت انتشار کی شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت و امارت سے تعبیر کیا گیا
 ہے اور اسی خلافت کو ہم اسلامی حکومت یا حکومت الہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف
 ناموں سے ہر دور میں مسلمان کا مطمح نظر اور اس کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ
 معیار رہی ہے۔ اور اس کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ

دنیا سے شر و فساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔

اسلامی خلافت اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت اور خلافت کی تعریف خود مستقین ہو جاتی ہے لیکن مزید توضیح کیلئے میں یہاں ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعریفیں نقل کرتا ہوں۔ ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے: "خلافت کے لغوی معنی جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آنحضرت صلعم کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دین اور دنیاوی امور میں فرمانروائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی و دنیاوی معاملات میں فرمانروائی کی حامل تھی۔ یہ فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کے نظم و نسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا" شاہ ولی اللہ صاحب نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے۔

"ہی الریاسة العامة فی التصدی لاقامة الدین باحیاء العلوم الدینیہ و اقامة اركان الاسلام والقیام بالجهاد وما يتعلق به من ترتیب الجیوش القرض للمقاتلة واعطاءهم من الفئی والقیام بالقضاء و اقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنہی عن المنکر نیابة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ازالة الخفا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں علوم دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو تربیت دینے مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور عہدہ قضا کے فرائض انجام دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔ یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف مستقین

۲۰
 کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار کو غمگینہم الفاظ میں یہاں واضح کر دیا گیا ہے اب جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اوتھا کہ نہیں ہے۔ کہ البتہ سے پوچھا جائے کہ اگر یہ خاص تصویر نہیں تو کیا ہے کسی ہدیت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد دائرہ کار امید یا لوجی کا متعین نہ ہونا ضروری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور اس کا نام اسلامی حکومت ہے۔ لیکن حقائق کو جھٹلنے پر اگر کوئی تل جاتے تو اس کا علاج ہی کیا ہے۔

اقامت خلافت کی دینی حیثیت اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے فوراً بعد یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے۔ فرض ہے نقل ہے مباح ہے۔ آخر کیا ہے۔

شریعت اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی بھی طرح وضو کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس پر کنوئیں سے پانی لکانا یا کسی سے طلب کرنا ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لئے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بناء پر کسی مسافر کیلئے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائزہ نہیں کہ وضو کے سجا

تیم کر لے بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو۔
 الانتروی ان تحصیل اسباب الواجب واجب و تحصیل اسباب الحرام حرام بالاجماع (مسلم النبی)
 کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع کا حاصل کرنا واجب اور حرام کے ذرائع کا حاصل
 کرنا حرام ہے بالاجماع۔

جس واجب کے اسباب اور شروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے فقہ نے
 دو قیدیں لگاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو۔ شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کی
 نسبت مقید ہو۔ دوسری یہ کہ وہ سبب یا شرط مقید ہو۔ ہوں و قیدوں میں کوئی ایک قید بھی اگر قاتب ہو جائے۔
 تو پھر سبب و شرط کی تحصیل واجب نہ ہوگی پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکوٰۃ کا
 مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے
 اور شرط حوالان حول ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور
 نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب
 نصاب بنے اور نہ کسی صاحب نصاب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے
 وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم
 مطلق نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔ شریعت کا مطالبہ یہ
 ہے کہ اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہو اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ
 رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح کے مقید حکم و طلب میں
 کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب و شرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ
 جب سبب اور شرط پائے جاتیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے دوسری قید کی مثال
 نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل

کسی پر واجب نہیں، اس لیے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو۔ لیکن اس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا کسی شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلف کرے کہ اپنا غلام آزاد کرے تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ *أَعْتَقْتُ* کا لفظ بالغی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے اس غلام کو آزاد کیا۔ اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہو سکتا لہذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی یا شارع نے کسی کو مکلف کر دانا کہ "علم حاصل کر" تاہر ہیکہ اس وجہ کا حصول سبب پر موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی اس لیے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحت ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں بلکہ صحت ادا کی ہے۔ یعنی بات یہ نہیں کہ جب تمہیں وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحت ادا صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے۔ جس کو سمجھ لینا چاہیے اسباب و شرط کی تحصیل کے وجوب و عدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمان کو دی گئی ہے اس کا وجود یا صحت ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہوگی۔ بالضرر کوئی شخص

دعویٰ کرتا ہے کہ قطع ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے۔ بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

علمائے حق اس پر مستفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان پر عمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جو تم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے لہذا ان احکام پر عمل کرنے کے لیے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔ (ماخوذ)

اس اصول کو جان لینے کے بعد آپ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھئے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دار و مدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد قطع ید حد قذف حد زنا حد خمر اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ کرنا یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے ہر رسول میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنفین ان کی باریکیاں بیان کرتے ہیں ان کے فوائد اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے والے سر دھنتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں آتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرط موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہو سکے ہدایت کے

محشی لکھتے ہیں :- واما وصف القضاء ففرض كفاية فلو امتنع الكل اثموا
وقد امر الله تعالى نبيه صلى الله عليه وسلم بقول "وان احكم بينهم بما
انزل الله اليك" وبعث صلى الله عليه وسلم علياً قاضياً الى اليمن ومعاذ او عليه اجماع المسلمين
رہا قضا کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو گنہگار ہوں گے اللہ تعالیٰ
نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور
اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کتاب المبیوطہ میں کتاب القاضی کی ابتدا ان الفاظ میں کی گئی ہے

اعلم بان القضاء بالحق من اقوى الفرائض بعد الايمان بالله تعالى وهو
من اشرف العبادات اجملة اثبت الله تعالى لادم عليه السلام اسم الخلافة فقال
جل جلاله اني جاعل في الارض خليفة ط واثبت ذلك لداود عليه السلام فقال عز وجل
"يا داود انا جعلتك خليفة في الارض" وبه امر كل نبى مرسل حتى خاتم الانبياء
عليهم الصلوة والسلام۔ قال الله تعالى انا انزلنا التوراة فيها هدى ونور يحكم
به البنيون وقال تعالى ان احكم بينهم بما انزل الله اليك ولا تتبع اھواھم۔ (مائدہ)

ترجمہ: جان لو حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل
ترین عبادت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے لیے خلیفہ کا
نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اسی چیز کو داؤد علیہ
السلام کیلئے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات
کا پھر نبی حتیٰ کے خاتم الانبیاء کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تو راست اتاری اس

میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں اور نثار شاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اس کے بعد صاحب بسوط نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام حضرت عمرؓ کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے: اما بعد فان القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة يعني فضا ایک حکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

سنة متبعة اى طريقة مسلوكة في الدين يجب اتباعها على كل حال یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہ السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شد و مد کے ساتھ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے

”مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝“

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ ظالم ہے۔

”مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝“

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ فاسق ہے۔

”مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝“

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمایا اور بتائیے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ قاضی کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت

ہے کہ صرف نکاح طلاق اور میراث کی ہی معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بلا استثنیٰ ساری معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کیلئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط و قیود کے ساتھ مفید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر کے دی ہیں یا دے سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبک دوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ ایک یا اختیار امام اور خلیفہ کا مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب "شرح عقائد شافعی" میں صاحب کتاب لکھتے ہیں :

ثم الاجماع على ان نصب الامام واجب والمذهب انه يجب على الخلق سماع قوله
صلعم من مات ولم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية ولان الامة قد جعلوا
اهم المهمات بعد وفات النبي صلى الله عليه وسلم نصب الامام حتى قد عرفت على الدفن
وكذا بعد موت كل امام ولان كثير من الواجبات الشرعية يتوقف عليه كما
اشار اليه بقوله والمسلمون لا بد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدود
هم رسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتصلة
وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول
الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغار الذين لا وليا لهم وقسمة الغنائم۔

ترجمہ : پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بناء پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا و جاہلیت کی موت مرا اور اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعیین کو قرار دیا یہاں تک کہ

۲۹
 دفن پر مقدم رکھا اور ایسا ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لیے بھی کہ بہت سے شریعی
 واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ ماتن نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسا امام
 ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں
 کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور باغیوں پوروں ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ
 وعیدین کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت
 ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لاوارث بچوں اور یتیموں کی شادی اور مال غنیمت کی
 تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

اتفق جمع اهل سنة وجميع المرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب
 الامامة وان الامة واجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم فهمهم
 احكام الله وليسوسهم باحكام الشريعة التي اتى بها رسول الله
 صلى حاشا البخعات من الخوارج الملل والنحل (ص ۳۷)

ترجمہ: تمام اہل سنت اور مجہد شیعہ بائٹناہ بخعات تمام خوارج امامت کے وجوب
 پر متفق ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے
 جو اللہ کے احکام قائم کرے۔ اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے
 جو اللہ کے رسول لاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب "ازالۃ الخقائق" میں لکھتے ہیں:

واجب بالكفاية امت برسولين الى يوم القيامة نصب الخليفة مستجمع شروط بجنه وجه
 يجمع انك صحابه رضوان الله عليهم به نصب خليفه وتعين وپيش از دفن آن حضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم متوجہ شدہ نہیں اگر از شرع وجوب نصب خلیفہ ادراک نمی کردند بریں امر خطیر مقدم

نہی ساختند و این وجہ اثبات دلیل شرعی از آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر وجہ اجمال۔
 ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چند
 وجوہ کی بناء پر پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے خلیفہ کے نصب اور تعین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم
 کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انہوں نے خلیفہ کے تعین کے وجوب کو شریعت سے ادراک
 نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے یہ صورت اجمالی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس
 بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ فرض کسی خاص وقت کیساتھ مخصوص کسی خاص مقام کیساتھ مقید نہیں ہے
 ہے اس لیے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک و مقامات اور موسموں خطرات کی بناء پر
 اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے
 کم نہیں۔ ایک مومن کے لیے صحیح روش یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی وسوسے کے مطابق اس
 کیلئے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہو سکتی
 ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کیلئے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت
 کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کیلئے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے
 پر آمادہ ہیں۔ انہیں خدا سے ڈرنا چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے
 ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کر سکتے ہیں لیکن خلافت علیٰ نہاج النبوت قائم
 کرنے کیلئے اقامت دین کی تائید نہیں کر سکتے بلکہ اس کے مقابلہ کیلئے محاذ بنا سکتے اور کوشش
 کرنے والوں کو غیر مسلموں کے سامنے مطعون کر سکتے ہیں۔

ظہر بین تفاوت رہ از کجاست تا کجا

ایک غلط فہمی کا ازالہ
 کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے اس لیے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جاسکتا لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل قبول اور قابل اجتناب قرار دینے کیلئے مقصود اور مقصود کی بحث کیوں چھڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کیلئے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انہیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا تا مقصود کے بجائے حرام نامکروہ ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سید صاحب طریقہ چھوٹنے کی وجہ یا تو لفظ غیر مقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش۔ فقہ کی اصطلاح میں کسی شے کے غیر مقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیر اہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیر مقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصودہ ہے اور وضو ستر عورت استقبال قبلہ اذان غیر مقصودہ ہیں لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت استقبال قبلہ نماز کیلئے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کر دے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لیے لغو ذلالت غیر اہم اور ناقابل اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگاتے گے۔

فقہاء نے امور دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ اعتقادات عبادات معاملات آداب حدود اور تعزیرات اس تقسیم کی بناء پر یہ کہتا ہے جانے ہو گا کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصود نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا گورے

لگانا سنگسار کرنا بھی اصل خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت و وجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا بھرتی کی پاسداری اور رعایت بھی جرم عظیم ہے۔

لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۝

ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں مقصود الفعل اور مطلوب التحصیل وغیرہ ہیں یعنی جن کا کرنا مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شے کیلئے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز روزہ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کیلئے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تفصیل و ادائیگی کے لحاظ سے عبادات مقصود پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی ارکا نہیں ہو سکتا کہ مومن کا مقصد رضائے الہی کا حصول ہے۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے ہم اقامت دین اور قیام خلافت کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الہی کا حصول ہی ہے تو کیا نفوذ باللہ ہم ان کے مکلف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح چاہیں رضائے الہی حاصل کریں۔ اسلامی

حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام طہنیک اس طرح ادا کئے جائیں جس طرح اللہ و رسول نے ہمیں سکھائے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے مومن کا مقصد اصلی رضائے الہی ہے۔ درجہ فیض مگر جو اس کے ذرائع و شرائط ہیں انہیں اگر تا مقصود کہہ کر الگ کر دیا جائے تو شریعت کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف بالا یتلاق جائز نہیں۔ لیکن اس طریقہ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الہی کے حصول کیلئے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کے حدود تعزیرات کی تنفیذ اور کتاب و سنت کے مطابق مقدار خاصات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اور ان کی شرط و وسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مست کو کیونکہ یہ مقصود نہیں تو ظاہر ہو کہ رضائے الہی کی تحصیل کا مکلف بنا تکلیف بالا یتلاق کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کیلئے جو اسباب و ذرائع اور شرط و ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے اگر وہ کوشش کرتا ہے اور ہر فرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ہے گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مرجاتا ہے تو پھر رضائے الہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندے کے لحاظ سے تھی کہ بندہ کا مقصود حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے والے اور انبیاء

اور سل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوندِ عالم کا کیا مقصد ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں، نہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ اس لیے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہو سکتا ہے کہ بندے کو کسی تفریق و امتیاز کے پر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا و آخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

مَا أَرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا ۝

(الذاریات ۳۳)

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

اس سلسلہ میں علامہ شاطبی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ۔

شرعیات وضع کرنے سے شارع کا مقصد یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اس لیے کہ شرعیات بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لیے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادت کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشاء پوری کر کے دنیا و آخرت دونوں جہاں میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لیے کہ بھی شارع کا مقصد شرعیات سے ضروریات یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شرعیات کے ان مصالح کو بروئے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ

تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔
قرآن میں آیا ہے۔

آمنو باللہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ (حدید)

انی جاعل فی الارض خلیفۃ

لیستخلفنکم فی الارض فینظر کیف تعملون 0

اور اللہ اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔
میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

جعلکم خلائف فی الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوہم فی ما اتاکم

اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ تمہیں آزمائے دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے کہ ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لیکر ایک امیر، ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے۔ جیسا کہ حدیث میں تفسیر کر دی گئی ہے۔

الامیر راع والرجل راع علی اہل بیتہ والامراتراعیۃ علی بیت زوجھا و ولدہا فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ

امیر نگران ہے اور مرد نگران ہے۔ اپنے گھر والوں پر اور عورت نگران ہے اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر پس تم میں کا ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق، جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورے کرے۔ (موافقات جلد

۲-۲۳۰)

علامہ شاطبی نے جو پہلوئیاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو

نامقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر بندے کا مطلوب رضا کے الہی ہے تو اللہ کو اس کی اطاعت و عبادت اور خلافت مطلوب ہے اسی لیے مومن جب تک نیابت الہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ نشانے الہی کی تفصیل سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

مسئلہ خلافت و امارت ہندوستان میں

ہماری اوپر کی گفتگو بڑی حد تک منقطع ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی امیر یا امام کی اطاعت سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ختم ہونے کے بعد شرعی نظام قائم کرنے کے لیے انگریزی اقتدار سے کسی نہ کسی انداز میں علماء، حکمرانے رہے ہیں۔ شاہ عبد. عزیز رحمہ اللہ علیہ، سید احمد ظہید مولانا اسماعیل رحمہ اللہ علیہ، مولانا قاسم نانوتی اور مولانا محمود الحسن وغیرہ کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں یہ حقیقت واقعہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

۱۹۱۳ء سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنادیا جائے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ مولانا آزاد کو جب اس طرز سے مایوسی ہو گئی کہ پورے ملک کے لیے کوئی مستفاد متحدہ نظم قائم ہو تو پھر انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اصلاً صوبے دار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ جب صوبہ بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

”میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارک بادوں کہ انھوں نے سہلقت با تحیرات کا منقام حاصل کیا۔ جمیعہ العلماء نے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بلا اتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا۔“

{ خطبات آزاد - ص ۱۳۷ }

اس طرح ہمارے ملک ہندوستان میں امیر الہند اور امیر شریعت کے انتخاب اور دارالقضاء کے قیام وغیرہ کا تصور اور کوشش کا ایک تسلسل ہے جو ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً جن بستیوں نے جتنا بھی خون پسینہ اس راہ میں بہایا ہے اور بہا رہے ہیں وہ ان کے لیے عند اللہ بخیر و درجہات کا سبب ہو گا اور اس لحاظ سے خصوصاً امارت شرعیہ بہار ۱۹۲۱ء کی کارکردگی تمام مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اے کاش ہندوستان کے بقیہ سارے علاقوں میں اسی طرح کی کوشش کی گئی ہوتی لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر

لصبہ امام خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ اور نظام کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دارالقضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی ساری کوشش تسمیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن پر اکتفاء اور قناعت کرنا صحیح نہیں ہوگا تسمیم ایک عارضی اور مجبوری کی چیز ہوتی ہے۔ لہذا اصل کے لیے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا۔

موجودہ حالات ہجر میں جو دارالقضاء بھی قائم کیا جائے گا اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود اور نظام کفر کے تحت دی ہوئی گنجائشوں کے اندر ہوگا۔ مثلاً نکاح، طلاق اور تقسیم وراثت جیسے چند مسائل سے متعلق کوئی قاضی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور اس کو بھی ملک کی عدالتوں میں چیلنج کر کے بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دارالقضاء کو حکومت کی ہند جواز حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جن نصوص قرآنیہ اور دلائل شرعیہ کی بنا پر ہم دارالقضاء کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ شادی بیاہ، طلاق اور تقسیم وراثت ہی نہیں بلکہ زندگی کے حملہ معاملات اور نزاعات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہو ورنہ ہم ان آیات کے مصداق قرار پائیں گے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (سورۃ المائدہ: ۴۴)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے امارت پر تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

الْم تَرَالِیَ الَّذِیْنَ یُزَعِّمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أَنزَلَ إِلَیْكَ وَمَا أَنزَلَ مِنْ قَبْلِكَ یُزَعِّمُونَ أَنَّهُمْ یَحْكُمُونَ (سورۃ النحل: ۸۶)

ترجمہ

”اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاند کا فیصلہ طاغوت سے کرانیں۔ حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دارالقضاء بھی قائم ہو سکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ یہ حالت مجبوری عبوری دور کے لیے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہیے۔ شاہد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہ ہماری مجبوری اور عدم

استطاعت بھی مقبول ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کی عمتا اور حتیٰ الوسیع کوشش سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی دائمی کی طرف متوجہ ہیں اسی پر کانع ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس کے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں جو انتہائی افسوسناک واقعہ ہے۔ اس کے لیے عوام تو خدا کے پاس بازار پر سے شامہ بیچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاہ میں قرآن حدیث و فقہ کے اصول و فروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔

اس طرح جو لوگ خلافت اسلامیہ اور نظام اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہو سکتی ہے کہ تم نظام کفر و شرک کو بھا کر نظام شرع اگر قائم نہیں کر سکتے تھے تو محدود پیمانے پر ہی ہی تم اپنی استطاعت کی حد تک حکم بجا انزل کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔

بہر حال دونوں کام کرنے کے ہیں ہر کام کا دین میں ایک اہمیت اور مقام ہے جس کو ہمیں سمجھنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی ایک تحریر سے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کر دوں، جس کو میں علی وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے نمونہ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے مسلسل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کار حل نہیں ہو سکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پزیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات الفردائی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کر لیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکروں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات

اسلام کے نظام اجتماعی کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں علیٰ اخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیق الہی سے اس وقت میرے گرد و پیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی عامل میں فرادی، متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں، ہمیشہ مجتمع، موتملف متحدہ اور نفس واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر و شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفریق و تشتت سے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور و مرکز کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کیے گئے عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادت و اعمال تک یہ حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے۔ اور اسی بناء پر بار بار نظام جماعت پر زور دیا گیا۔

علیکم بالسمع والطاعة (رواہ ترمذی)

اور علیکم بالشايع فان الشيطان مع اللفذ وهو من الاثمنين بعد ۱۱۳۴ (رواہ البیہقی)

اور اذکان ثلاثی سفر لیلوم واحد کم ۱۱۳۴ (رواہ اصحاب السنین)

اور اسی لیے نظم و قوام ملت کی منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب و سنت اس بارے میں بے شمار اور حد احصاء و استقصاء سے باہر ہیں۔ رسالہ خلافت میں پر بحث کر چکا ہوں، اور زیادہ شرح و تفصیل تفسیر قرآن میں ملے گی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا، کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازہ اجتماع پر انگڑا ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے، نتیجے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ایں ہمہ تفریق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظام جماعت بھی قائم رہا۔ لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظم جماعت درہم برہم ہو گیا اور سرسراہلیت کی سی بے نظمی و بے قیودی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آل عثمان کی موجود تھی اور مسلمانان ہند کے لیے بھی تمام مسلمانان عالم کی طرح وہی خلیفہ و مطاع تھے لیکن مسلمانان ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علاقہ و عملہ پایگاہ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنے فرض اسلامی

انجام دیتے اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہ ہے کہ دشوار تھا اعادہ حال اور ہتھیہ کار اور ادائے فرض اسلامی میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ و استیلاء پر محکومانہ قناعت کر لی گئی وہیں اس اولین فریضہ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عوام کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہر حال ایک زمانہ وراثہ اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرہ ارض میں سب سے بڑی ایک جماعت ہے ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ انساک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ۔ نہ تو کوئی قائد دامیر ہے اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے ایک ابوہ ہے، ایک گلہ ہے، جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی و جاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہو گئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد و شرور میں ایک بہت بڑا مشہدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہو سکتا اور قاضی کا وجود امارت و امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات!

ایک منصب قضاء ہے ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے، پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لیے محض نام ہندو قاضیوں کا تقریر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات!

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمالِ ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرع وادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور ابوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں جن کے لیے اولین شرط عقلا و شرعا وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیحہ شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے، مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لیے بنیاد ہیں مگر بحکم اشمازات قلوب الذین لایؤمنون بالاخرۃ (۱۳۵) طریق شرعی اور اس کے نظام و قوام کے الفاظ سن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد و اصولوں کو سامنے لائیں جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں؟ میں

پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قلم اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر و امام کا لفظ آجائے تو نفرت و استکراء سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی غلطی نہیں جس کو راہ تاسمیں اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑئیے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض شرعی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ آج ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک مرشد غفلت تھے۔ اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفہ عہد، حفاظت و صیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔ خدا را بتلائیے اس صورت حال میں بھی طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟ اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں؟ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ یا محض انجمن سازی اور ہنگامہ مجلس آرائی؟ کیا محض اجماع رائے کی تقلید اور باب فن و تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو لقمہ آج یورپ سے اٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تاتار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا اسی حال تھا جو آج نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلا ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولایت مسلمانین کے نصب و تقریر کا حکم لیا آئی بناء پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکمہ کفار میں طلب والی مسلم آبادت واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے انہیں بلاد محکمہ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امیر کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرعیہ کی روئے مسلمانان ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی وہی راہیں ہیں۔

۴۰
یا تو ہجرت کر جائیں یا نظامِ جماعت قائم کر کے اداائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔ مولانا آزاد اور محمد اللہ علیہ نے جن دو راہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب و سنت، تاریخ انبیاء اور سیرت خاتم النبیین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے۔ درحقیقت تیسری راہ یعنی اہل کفر و شرک کے مستحلاً اور ہلا کر اہیت ماتحت اور زیر نگین ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایستثنائی اور عارضی صورت حال کی بات الگ ہے کہ اس وقت ارتکابِ حرام کی بھی اجازت نکل آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہجرت کا مرحلہ دوسرے نمبر پر ہے۔ دینی اور شرعی زندگی گزارنے اور اشاعتِ دین اور غلبہ حق کے لیے راہیں جب بالکل بند ہو جائیں تو ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کوشش کے بغیر ہجرت کرنا فرار اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز کے ہم معنی ہوگی جو ناقابلِ معافی جرم ہے۔

قیمت - ۴/-
ناشر - مکتبہ النجوم سعید آباد حیدرآباد

- ملنے کے پتے
• مکتبہ النجوم ۱۱-۱۰-۱۶ سعید آباد حیدرآباد ۶۵۹
• المکتبہ پبلشرز میوڑکا پبلکس عابدس حیدرآباد
• القلم پبلشرز سعید آباد حیدرآباد
• گوشر ایجنسی چھتر بازار حیدرآباد